ڈاکٹر صادق ندیم

سلیمان البستانی کا مقدمۂ الیاذہ

سلیمان البستانی جدید عربی ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کا وطن لبنان تھا۔ ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ بیروت میں تعلیم حاصل کی جہاں انھیں ناصیف الیازجی اور یوسف الاسیر جیسے اساطین فکر سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ عربی زبان و ادب میں مہارت تامہ حاصل کرنے کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ ان کی علمی استعداد سے متاثر ہو کر مشہور ادیب المعلم بطرس البستانی نے انھیں اپنے مدرسے میں تدریس کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول کر لی اور ساتھ ہی دائرۃ المعارف وغیرہ میں لکھنا شروع کر دیا۔ ۱۸۸۷ء میں انھوں نے یونان کے عظیم شاعر ہومر (HOMER) کی شہرہ آفاق تصنیف الیاذہ (ILIAD) کے منظوم ترجمے کا آغاز کیا۔ ابتدا میں فرانسیسی اور انگریزی تراجم کی مدد سے ترجمہ کیا مگر مطمئن نہ ہوئے اور یونانی زبان کا مطالعہ شروع کیا۔ ایک عیسائی پادری سے یونانی زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور مفید حواشی لکھے اور فہارس و معاجم کا اضافہ بھی کیا اور اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ یہ ترجمہ ان تمام اوصاف کے ساتھ ۱۹۰۴ء میں مصر کے مطبع الہلال سے شائع ہوا۔ یہ ۱۲۶۰ صفحوں کی بڑے سائز کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، جس سے راقم الحروف مستفید ہوا ہے۔ الیاذہ کا مقدمہ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہومر اور الیاذہ سے متعلق معلومات کے علاوہ عربی ادب و ثقافتِ اسلامیہ پر بھی بہت سا مواد موجود ہے۔

سلیمان البستانی نے مقدمۂ الیاذہ کا آغاز ہومر کے حالاتِ زندگی سے کیا ہے۔ اس کے نام و نسب و مولد اور دیگر ضروری امور پر محققانہ نظر ڈالی ہے اور بڑی اہم اور دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں، جن کے متعلق تاریخی شواہد بھی دیے ہیں۔ انھوں نے ہومر کے متعلق مختلف ادوار میں مختلف آرا کا ذکر کیا ہے اور انگریزی، فرانسیسی اور جرمن کتابوں کے حوالے بھی دیے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بحث کو عربی ادب اور اسلامی ثقافت سے مربوط کرتے ہیں۔ وہ جہاں بھی موقع ملتا

ہے، یونان و عرب کا تقابل ضرور کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے "قول العرب فیہ" کے عنوان سے ایک مختصر سا باب تحریر کیا ہے، جس سے عہد عباسیہ کے دور کی اسلامی ثقافت اور ہومر شناسی کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسی عربی تصنیف نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کلام ہومر کو عربی زبان میں منتقل کیا گیا ہے۔ عہدِ عباسیہ کے خاص خاص علما کلام ہومر سے شناسا تھے، اور بعض خواص مجالس میں الیاذہ کو پڑھا جاتا تھا اور اہلِ ذوق اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر اس کا عربی زبان میں ترجمہ نہیں کیا گیا۔ یونانی اور سریانی زبانوں سے تراجم کرنے والے مقربینِ خلفا ہومر کے اشعار یونانی میں پڑھتے تھے اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ دورِ عباسیہ میں ایرانی اور کلدانی خواص میں ہومر کے کلام کے مطالعے کا رواج تھا۔ اس دور کا ایک مترجم تاوفیلس الرہاوی ہے جس نے ہومر کا سریانی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ وہ خلیفہ مہدی کا منجم تھا جیسا کہ البستانی نے الیاذہ کے حواشی میں صفحہ ۲۶۲ پر ثابت کیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ اپنی کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطبا میں حنین بن اسحٰق کے سوانح حیات میں یوسف بن ابراہیم کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "خرشی (رشید کی یونانی کنیز) نے اس لڑکے (اسحٰق المعروف بابن الخصی) کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اسے یونانی آداب وکتب سے مؤدب کیا، اس نے یونانی زبان ایک عالم کی طرح سیکھ لی اور اس زبان کا منتہائے کمال بن گیا۔ ہم اکثر اہلِ ادب کی مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اسحٰق بن الخصی بیمار ہوا تو میں اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا۔ میں نے وہاں ایک لمبے بالوں والے شخص کو دیکھا جس کے بالوں نے اس کے چہرے کے کچھ حصے کو ڈھانپ رکھا تھا اور وہ یونانی زبان میں یونان کے عظیم شاعر اومیرس (ہومر) کے اشعار سنا رہا تھا۔ اس کی آواز کا ترنم حنین کی آواز کے ترنم سے ملتا جلتا تھا۔ حنین سے ملے ہوئے مجھے اس وقت دو سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسحٰق بن الخصی سے پوچھا کہ کیا یہ شخص حنین ہے؟ مگر اس نے ایسا انکار کیا جو دراصل اقرار تھا۔ چنانچہ میں نے اسے حنین کہہ کر پکارا تو اس نے میری پکار کا جواب دیا۔"[۵]

---

[۵] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۸۵

اس سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ اس عہد میں یونانی زبان سے اہلِ بغداد آشنا تھے اور اس کی تعلیم دی جاتی تھی، لوگ اسے پڑھتے بھی تھے، خلفا کے محلوں میں بھی اس کی تدریس ہوتی تھی اور ہومر کی منظومات غیر ملکی زبانوں سے دلچسپی رکھنے والوں میں معروف تھیں۔"

سلیمان البستانی نے "عیون الانباء فی طبقات الاطبا" سے چند اور حوالے نقل کیے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس عہد کے لوگ ہومر سے آشنا تھے۔ انھوں نے نامور مسلمان مصنفین کی کتب سے ہومر کا تذکرہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابو ریحان محمد البیرونی کی الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ سے ان کا مندرجہ ذیل دلچسپ قول نقل کیا ہے: "متقدم الذکر امیروس (ہومر) کا یونانیوں کے ہاں وہی مقام ہے جو امرء القیس کا مقام عربوں میں ہے۔"[۱]

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمے میں ہومر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"شاعری کچھ عربوں تک ہی مختص نہیں، دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ یہاں عرب و عجم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ایران و یونان میں شعرا ہوئے ہیں، ان میں سے ارسطو نے اپنی کتاب المنطق میں اومیروس (ہومر) شاعر کا ذکر کیا ہے اور اس کی مدح و ثنا کی ہے۔"[۲]

شہرستانی "کتاب الملل والنحل" میں رقم طراز ہیں:

اومیروس عہدِ قدیم کا عظیم شاعر ہے جسے افلاطون اور ارسطو اعلیٰ مرتبے کا شاعر سمجھتے ہیں اور اس کے اشعار سے استدلال کرتے ہیں۔ ان اشعار میں علم کی پختگی، متانت، حکمت، جودتِ رائے اور جزالت اللفظ مجتمع ہوتی ہیں۔"[۳]

شہرستانی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں اور البہاء العاملی نے "الکشکول" میں ہومر کے کلام سے شواہد پیش کیے ہیں۔

ابو الفرج الملطی المعروف بابن العبری نے اپنی کتاب "تاریخ مختصر الدول" میں ہومر کا کثرت

۱؎ الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ، طبع پیرس، ص ۸۶

۲؎ مقدمہ ابن خلدون: باب اشعار العرب واھل الامصار

۳؎ الملل والنحل، ج ۲، ص ۱۵

سے تذکرہ کیا ہے۔

مندرجہ بالا حوالوں سے عہدِ عباسی اور اس کے بعد کی اسلامی ثقافت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اسلاف ادبیاتِ عالم سے آگاہ تھے، اور خواص ہومر کے کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے، مگر اس امر کا کوئی حوالہ صاحبِ مقدمہ الیاذہ کو نہیں مل سکا جس سے یہ پتا چلے کہ ہومر کی منظومات کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ چنانچہ سلیمان بستانی کی تحقیق یہی ہے کہ ان سے پہلے کسی نے ہومر کو عربی میں منتقل نہیں کیا۔ اس کی تائید میں انھوں نے سید جمال الدین افغانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک مجلس میں انھوں نے ان (سلیمان البستانی) سے کہا "ہمیں اس بات سے انتہائی مسرت ہوگی اگر تم وہ کام کرو جو عربوں کو آج سے ایک ہزار سال پہلے کرنا چاہیے تھا۔ کتنی اچھی بات ہوتی کہ وہ تمام ادیب جنھیں مامون نے جمع کر رکھا تھا، الیاذہ کا فوری طور پر عربی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیتے، خواہ ایسا کرنا انھیں فلسفۂ یونانی کے عربی میں منتقل کرنے سے یکسر غافل کر دیتا۔"

ہومر کی "الیاذہ" سے متعلق مختلف موضوعات پر بحث کرتے ہوئے (جو کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے) وہ ترجمۂ الیاذہ سے عربوں کی کوتاہی کے اسباب تلاش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کے تین اسباب ہیں، (۱) دین (۲) عربوں کی یونانی زبان سمجھنے میں دشواری اور (۳) مترجمین کا نظمِ شعر پر قادر نہ ہونا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام الیاذہ کے ترجمے کی راہ میں حائل ہوا۔ چوں کہ اس میں دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہے، اس لیے اس کا ترجمہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ راقم الحروف کے خیال میں یہ کوئی وزنی وجہ نہیں ہے۔ مسلمان نہایت ہی وسیع الخیال تھے اور اس زمانے میں اس طرح کی کوئی تنگ نظری نہ تھی۔ دراصل یہ بات انھوں نے نصرانیت کے نقطۂ نظر سے کہی ہے۔ وہ "الیاذہ اور نصرانیت" کے باب میں عیسائیوں کی اس بنا پر شروع میں ہومر کی مخالفت کا ذکر کر آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی بات اسلام اور مسلمانوں پر بھی چپکا دی۔ حالاں کہ خود بہت سے علمائے یورپ کہتے ہیں کہ قرونِ وسطی کے مسلمان عیسائیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ فراخ دل تھے۔

دوسری وجہ قرینِ قیاس ہے یعنی چوں کہ عرب شعرا یونانی زبان سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے تھے، اس لیے وہ الیاذہ کو عربی میں منظوم نہیں کر سکتے تھے۔ مگر تیسری وجہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر مترجمین (یعنی حنین بن اسحٰق وغیرہ) شعر کہنے اور نظم لکھنے کی قدرت نہ رکھتے تھے

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ الیاذہ کا سرے سے ترجمہ ہی نہ کیا جاتا - آخر اس کا ترجمہ نثر میں بھی کیا جاسکتا تھا جیسا کہ فردوسی کے شاہ نامہ کا منثور ترجمہ کیا گیا- اس اعتراض کا وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ عربوں اور ایرانیوں میں جو اختلاط تھا وہ یونانیوں اور عربوں کے میل جول سے کہیں زیادہ تھا، اس لیے یونانی ادب کی نسبت فارسی ادب کی طرف زیادہ رجحان ہونا قدرتی امر ہے، اور یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ خود الیاذہ اور شاہ نامے کے مصنفوں کے مابین بھی بہت فرق ہے، اور وہ یہ کہ ہومر کا تعلق ایک بت پرست قوم سے تھا اور فردوسی ادبائے اسلام میں سے تھا- مگر اس کے باوجود شاہ نامے کا عربی ترجمہ اس وقت تک نہ ہوسکا جب تک کہ ایک ایسا حکمران پیدا نہ ہوا، جو عربی اور فارسی کا بیک وقت فہم رکھتا تھا- جب وہ اصل زبان فارسی میں شاہ نامے سے لطف اندوز ہوا تو اسے خیال آیا کہ وہ اس کی تعریب کے ذریعے اپنی قوم کو لذت اندوز کرے[۵] اور یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جب شعر کا نثر میں ترجمہ کیا جائے تو اس کا حسن ختم ہو جاتا ہے اور اس کی روایت کرنے والے بھی درماندہ ہو جاتے ہیں- یہی معاملہ شاہ نامہ کی تعریب کے ساتھ پیش آیا- لوگوں نے اسے گل دستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا-

سلیمان البستانی لکھتے ہیں کہ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ادبائے عرب کی راہ میں تعریبِ الیاذہ کے سلسلے میں جو بھی رکاوٹیں تھیں، اب وہ رکاوٹیں باقی نہیں رہیں، بلکہ اب تو زمانے کا تقاضا ہے کہ الیاذہ کو عربی زبان کا جامہ پہنایا جائے- خصوصاً بت پرستی کی کہانیوں کا اس عہد میں کسی قسم کا اثر باقی نہیں رہا- چنانچہ وہ پہلے شخص ہیں جو الیاذہ کو عربی میں منتقل کرنے کا اعزاز حاصل کرتے ہیں-

الیاذہ کا یہ مقدمہ گوناگوں معلومات کا خزانہ ہے- ہم نے اس میں سے اسلامی اور عربی ثقافت کا پہلو اجاگر کیا ہے- بستانی نے اپنی مربوط بحث کے دوران عربی ادب اور زبان کا دلچسپ اور فکر انگیز جائزہ لیا ہے، جس کے بیان کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے- ان میں سے چند عناوین یہ ہیں: التعریب، معربو العرب، اوزان الشعر والبوا بہ، الالیاذہ والشعر العربی،

---

۵ فتح بن علی البغدادی الاصبہانی نے ملک المعظم عیسیٰ بن العادل ابی بکر الایوبی کے لیے شاہ نامۂ فردوسی کا عربی نثر میں ترجمہ کیا تھا- یہ ترجمہ ۶۲۰ھ میں مکمل ہوا- (کشف الظنون)

الشعر القدیم، القرآن ولغة القریش، المقابلة بین لغة القریش المضریة ولغة الالباذة الیونانیه وکیف ماشت الاولی وتلاشت الثانیه، اطوار الشعر العربی وطبقات الشعرا، ملاحم العرب، ملاحم الاعاجم، علوم الادب عند المولدین۔

برصغیر پاک وہند میں علم فقہ

محمد اسحاق بھٹی

اس کتاب میں سلطان غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ) کے عہد سے لے کر سلطان اورنگ عالمگیر (۱۱۱۸ھ) کے عہد تک کی تمام فقہی مساعی کا احاطہ کیا گیا ہے اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک وہند علم فقہ سے کس طرح روشناس ہوا، یہاں کے علما و زعما نے کس محنت و جاں فشانی سے اس کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کیا اور کن اہم فقہی کتابوں کی تدوین کی۔ برصغیر پاک و ہند کے جن سلاطین کے دور حکومت میں کتب فقہ مرتب کی گئیں، ان کے عہد اور طریق حکومت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس زمانے کے علمائے کرام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ حکمران علم و علما سے کس درجہ تعلق و ربط رکھتے تھے۔ پھر فقہ کی جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے اہم اقتباسات بھی فاضل مصنف نے درج کتاب کیے ہیں۔ آخر میں فقہ کی ان مشہور کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں جو مختلف ملکوں میں تصنیف کی گئیں جن کو مسائل فقہ کے اصل ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع سے متعلق اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

صفحات ۴۰۸ قیمت ۴۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور